بنیادی اخلاقی فضیلت؛ معیار اور خصوصیات

BASIC MORAL VIRTUE; CRITERIA & CHARACTERISTICS

Mohib Raza

Abstract

Determination of the scope of morality and the basic virtue are very important issues of moral knowledge. The basic maral virtue can direct moral attributes and actions towards desired objectives. In this article, the focus is on the standard according to which the acquired qualities and voluntary actions of man are valued. As a result, it becomes clear that the source of all attributes, actions and standards is the essence of Almighty Allah and His wisdom. The second and third parts of the article discuss the basic moral virtue, its quality and characteristics. According to writer "Theism" is the basic moral virtue for all moral virtues and its standard is closeness to Allah Almighty. This is a voluntary and internal phenomenon that results in the form of faith and, actions follow such a state.

Keywords: *Moral Knowledge, Baisc Virtue, Theism, Criteria.*

خلاصہ

اخلاقی فضائل کے دائرہ کار کے تعین کے ساتھ بنیادی اخلاقی فضیلت کا تعین، علم اخلاق کے مہم ترین مسائل شمار ہوتے ہیں۔ در حقیقت، بنیادی اخلاقی فضیلت ہی ہے جو اخلاقی صفات اور افعال کو انسان کے مطلوبہ ہدف کی جانب رخ دے سکتی ہے۔ اس مقالے کے پہلے حصہ میں بحث کا محور یہ ہے کہ انسان کی اکتسابی صفات اور اختیاری افعال کس معیار کے مطابق قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔اس حصے میں یہ نتیجہ لیا گیا ہے کہ تمام اخلاقی صفات و افعال اور معیارات کا مبداء اللہ تعالی کی ذات اور اس کی حکمت ہے۔ مقالے کے دوسرے اور تیسرے حصے میں بنیادی اخلاقی فضیلت اور اس کے معیار و خصوصیات کے متعلق بحث کی گئی ہے۔اس حصے کے مطابق، خدا پرستی ہی وہ بنیادی اخلاقی فضیلت ہے جو تمام اخلاقی فضائل کی بنیاد ہے اور خدا پرستی کا معیار، قرب خداوندی ہے۔ یہ ایک اختیاری اور قلبی امر ہے جو ایمان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور عمل اس کا لازمہ ہے۔

کلیدی الفاظ: علم اخلاق، بنیادی فضیلت، خدا پرستی، معیار۔

تعارف

اس مادی دنیا کی سب سے بڑی ظاہری حقیقت موت ہمارے سامنے دو، تین بنیادی سوال رکھتی ہے : یہ کہ کیا کوئی اور جہان ہے جہاں انسان نے جانا ہے یا موت کے ساتھ ہی اس کی حیات کا سفر ختم ہو جاتا ہے؟ انسان کی پیدائش کسی اتفاقی حادثہ یا طبیعی ارتقاء کا نتیجہ ہے یا کسی باتدبیر خالق کی تخلیق ہے؟ آیا انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک، اپنے تمام افعال کسی خاص مقصد اور ہدف کو سامنے رکھ کر انجام دیتا ہے یا بے ہدف؟

درحقیقت، ایک انسان چاہے اس مادی زندگی کو ہی سب کچھ جانے یا اس سے اگلے جہان کی زندگی کا قائل ہو، اس کا کوئی بھی فعل بے مقصد نہیں ہوتا۔ انسانی افعال اور ان کے اہداف کا یہ سلسلہ، بالآخر ایک بالاتر اور آخری ہدف پر جا کر ختم ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے انسان یہ تمام تگ و دو کرتا ہے۔ لہٰذا ہر انسان لازمی طور پر ایک یا چند اہداف رکھتا ہے جو اس کی زندگی میں انجام پانے والے تمام افعال کا محرک بنتے ہیں۔[1] فی الواقع، انسان کے انتہائی ہدف اور مقصد کا تعین، ان بنیادی سوالات کے متعلق اس کے فہم اور نظریے پر منحصر ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ہاں، مقصد کا یہ تعین آگاہانہ بھی ہو سکتا ہے اور سوچے سمجھے بغیر، نیم آگاہانہ بھی۔ بہر صورت، اس انتہائی مقصد کا حصول، انسان کی کامیابی کا معیار ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لیے انجام دیے جانے والے تمام دوسرے افعال، انسان کی کامیابی کا مقدمہ ٹھہرتے ہیں۔ انتہائی ہدف کے حصول کی راہ میں مقدمہ کے طور پر انجام دیے جانے والے افعال کے علاوہ انسان کی صفات بھی اسے اپنی زندگی کے مطلوبہ ہدف تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ صفات انسان کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہیں اور ان کا انسان کے افعال کے ساتھ دوطرفہ تعلق ہوتا ہے۔ ایک طرف یہی صفات انسان سے مخصوص افعال کے سرزد ہونے کا موجب بنتی ہیں تو دوسری طرف، ان افعال کی بجاآوری، انسان کے اندر ان صفات کی ایجاد کا باعث بنتی ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ انسان کی تمام اخلاقی صفات و افعال میں سے کون سی صفت یا فعل، برتر اور اساسی فعل یا فضیلت ہے جو انسان کے انتہائی مقصد تک پہنچنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس مقالے میں اسی اہم سوال پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فلاسفۂ اخلاق کی نظر میں فضیلت

فضیلت کے بارے میں ایک اولین نظریہ، افلاطون[2] اور ارسطو کا پیش کردہ نظریہ اعتدال ہے کہ جو قرن سوم و چہارم ہجری میں اسلامی دنیا میں وارد ہوا۔ اور اکثر مسلمان فیلسوفان جیسے فارابی، ابن مسکویہ، خواجہ نصیر الدین طوسی وغیرہ نے اس کو اپنے اخلاقی آثار میں بنیاد بنایا۔ اس نظریے کے مطابق فضیلت کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی عقل کی بنیاد پر ہر فعل میں افراط اور تفریط سے بچتے ہوئے میانہ روی اختیار کرے۔ جبکہ یہ افراط اور تفریط، فضیلت کے مقابلے میں رذیلت شمار ہوں گی۔ ارسطو کے نزدیک فضیلت کا معیار انسان کا کمال ہے اور کمال کی پیدائش

کا موجب اعتدال اور میانہ روی کی رعایت ہے۔[3] اس نظریے کے مطابق، انسان بنیادی طور پر تین قوتوں، قوہ شہویہ، قوہ غضبیہ اور قوہ عقلیہ کا حامل ہے۔اور ان تینوں قوتوں میں راہ اعتدال، انسان کے اندر عفت، شجاعت اور حکمت کی صفات پیدا کرتی ہے۔ان قوتوں کے درمیان یہ اعتدال پیدا کرنا، عقل کاکام اور بنیادی فضیلت ہے۔ معلم ثانی ابو نصر فارابی کی نگاہ میں علم اخلاق ایک شخص کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے وظائف طے کرنے والے قواعد کی آگاہی سے عبارت علم ہے۔یہ آگاہی انسان کی سعادت کی ضامن ہے۔فضیلت کے مسئلے میں فارابی نے بھی ارسطو کے نظریے کی تائید کی۔[4]

احمد بن محمد بن یعقوب بن ابن مسکویہ، پنجم ہجری میں ابن سینا کے ہم عصر دانشمند رہے ہیں اور فلسفہ، اخلاق، طب، تاریخ، اور ادبیات کے شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی انسانی نفس کو تین قوتوں کا حامل گردانا اور فضیلت کی یہ تعریف کی کہ فضیلت رذایل کے وسط میں ہوتی ہے۔اس لحاظ سے یہ بھی نظریہ اعتدال کے پیرو تھے۔ان کے بقول عدالت، فضیلت کا جزو نہیں بلکہ خودِ تمام فضیلت ہے۔[5] چھٹی ہجری میں امام غزالی کا بھی یہی نظریہ تھا اور انہوں نے بھی حدوسط اور اعتدال کی بات کی۔[6] ساتویں ہجری میں خواجہ نصیر الدین ابو جعفر محمد بن محمد بن حسن طوسی نے اپنی کتاب اخلاق ناصری میں ذکر کیا ہے کہ فضائل عفت، شجاعت، حکمت اور عدالت ہیں، جن میں سے عدالت زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔[7] موجودہ دور تک۔جس میں دور معاصر کے ملا فیض کاشانی، ملا محمد مہدی نراقی، مجتبیٰ تہرانی، روح اللہ خمینی وغیرہ بھی شامل ہیں۔اکثر مسلمان علمائے اخلاق کا اخلاقی فضائل کے بارے میں نظریہ اجمالی طور پر یہی رہا ہے۔لیکن موجودہ دور میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے قرب الٰہی میں انسان کے کمال کو پوشیدہ قرار دیتے ہوئے توحید کو تمام اخلاقی فضائل کا مبدا، اساس اور ام الفضائل قرار دیا ہے۔[8] اس تناظر میں اخلاقی فضائل کی بنیاد، انسان کی ذات سے بالاتر ایک کامل، مطلق، حقیقی اور واقعی معیار پر قائم ہے۔اس مقالے میں توصیفی روش کو استعمال کرتے ہوئے اسی بنیادی اخلاقی فضیلت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ضرورت تحقیق

اخلاقی فضائل کی دستہ بندی کے کئی معیار ہو سکتے ہیں جیسے:

- فضائل کی بنیاد اور منشاء ہونے کے اعتبار سے۔
- انتہائی مقصد تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کرنے کے اعتبار سے۔
- انسانی قویٰ کے اعتبار سے۔
- انسانی سن وسال کے اعتبار سے۔

- تربیت میں ترجیح دینے کے اعتبار سے۔

اس مقالے میں اخلاقی فضائل کی بنیاد اور منشاء ہونے کے اعتبار سے اساسی و بنیادی اخلاقی فضیلت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ اعتبار نہایت اہمیت کا حامل ہے چونکہ اگر فضائل کی بنیاد کو درست طور پر پہچان لیا جائے تو اس کی مدد سے کوئی بھی انسان اپنے تمام صفات و افعال کو صحیح رُخ دے کر اپنے مقصدِ زندگی کو بخوبی حاصل کر سکتا ہے۔ نیز، اساسی فضیلت، اقدار و فضائل میں تزاحم اور کشمکش کی صورت، مہم یا درست فضیلت کے چناؤ کے سلسلے میں بھی مدد کر سکتی ہے۔ زیرِ نظر تحقیق ایک بنیادی اور تین ذیلی سوالات کی حامل ہے: اصلی سوال یہ ہے کہ "اخلاقی فضائل میں سے بنیادی اخلاقی فضیلت کونسی ہے؟" فرعی سوالات یہ ہیں کہ: الف) اخلاقی فضائل کا دائرہ کار کیا ہے؟ ب) کسی فضیلت کو بنیادی اخلاقی فضیلت قرار دینے کا معیار کیا ہے؟ ج) بنیادی اخلاقی فضیلت کی خصوصیات کیا ہیں؟

مفاہیم شناسی

چند بنیادی اخلاقی مفاہیم اس تحقیق کی بنیاد فراہم کریں گے اور ان مفاہیم سے استخراج شدہ کلی اصولوں کی روشنی میں اساسی فضیلت تک پہنچنا ممکن ہو پائے گا۔ ان مفاہیم کو کلی طور پر تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ان مفاہیم کا جائزہ، اخلاقی فضائل کا دائرہ کار اور نتیجتاً بنیادی اخلاقی فضیلت کے خدّوخال واضح کرے گا۔ جہاں تک اخلاق کے مفہوم کا تعلق ہے تو اخلاق، خُلق یا خُلق کی جمع ہے اور لغت میں اس کا معنی سرشت، خو، طینت یا عادت کے معنی میں آیا ہے[9]۔ خلق کا لفظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے رسول خداﷺ کے بارے میں ارشاد ہے: وَإِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيمٍ (4:68) ترجمہ: "بے شک آپ عظیم الشان خلق پر قائم ہیں۔" مجموعی طور پر اخلاق کے لغوی معنی سے مراد پائیدار نفسانی صفات ہیں۔ یہ عادات یا صفات پسندیدہ بھی ہو سکتی ہیں جیسے شجاعت یا صداقت وغیرہ اور ناپسندیدہ بھی جیسے بزدلی یا بخل وغیرہ۔[10] جہاں تک اصطلاح کا تعلق ہے تو علمائے اخلاق نے اخلاق کے درج ذیل تین اہم اصطلاحی معنی بیان کیے ہیں:

۱۔ **تمام پسندیدہ و ناپسندیدہ نفسانی صفات:** چاہے پائیدار ہوں اور ان کا اظہار ہمیشگی ہو یا یا ناپائیدار ہوں اور کبھی کبھار ظاہر ہوتی ہوں۔ یہ معنا، اخلاق کے لغوی معنی سے عام تر ہے۔

۲۔ **تمام پسندیدہ و ناپسندیدہ صفات اور افعال:** چاہے پائیدار ہوں یا ناپائیدار۔ یہ معنی مزید عام ہے اور صفات کے ساتھ ساتھ افعال کو بھی اخلاق کے دائرے میں شامل کرتا ہے۔

۳۔ **فقط پسندیدہ صفات اور افعال۔** یہ معنی، پچھلے معنی سے خاص ہے اور ناپسندیدہ صفات اور افعال کو اخلاق کے دائرے میں شامل نہیں کرتا۔

چونکہ اس بحث میں انسان کے انتہائی مطلوب مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے، اخلاق کے دائرہ کار میں صفات یا افعال کی شمولیت اور ان کی خصوصیات کا معیار طے کیا جانا ہے، لہٰذا ہمارے مورد نظر، اخلاق کی دوسری تعریف اور دائرہ کار ہے۔ بنابریں، ہماری نظر میں تمام پسندیدہ و ناپسندیدہ صفات و افعال، علم اخلاق کا موضوع بحث ہیں۔

اختیاری افعال اور اکتسابی صفات

موضوع کے تعارف میں ذکر ہوا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے انتہائی مطلوب مقصد یا مطلوب زندگی کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کوشش کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کو ایک بااختیار مخلوق تصور کیا جائے۔ اختیار، یعنی انسان کسی فعل کی آگاہی رکھتے ہوئے، اسے اپنے ارادے کے ساتھ انجام دے۔ انسان کی کوشش کی قدر و قیمت بھی صرف اسی صورت میں ہی طے پا سکتی ہے کہ جب یہ کوشش اختیاری ہو۔ درحقیقت، اختیار رکھنے کی یہ حس ہی اس کو کوشش کرنے اور آگے بڑھنے پر ابھارتی ہے: وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (39:53) ترجمہ: " اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہوگی۔" اگر اسے یہ احساس ہو کہ کمالات حاصل کرنے اور مقصد کو پانے میں اس کی کوشش اور اختیار کا کوئی دخل نہیں تو اصلاً حرکت کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہو پائے گا اور کسی قسم کا کوئی احساس مسئولیت پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ، اگر انسان کو مجبور محض سمجھا جائے تو صفات و افعال کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے یا ان کے بارے امر و نہی کا بھی کوئی فائدہ نہیں رہے گا۔[11]

البتہ اس اختیار رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے اختیار میں خداوند عالم کی عنایت کا محتاج بھی نہ ہو۔ انسان کا اختیار، خدا کے فیض اور عطا کا ایک مظہر ہے۔ اس لحاظ سے انسان کا یہ اعتباری اختیار ایک فطری، بدیہی اور حقیقی امر الٰہی ہے۔[12] پس چونکہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اختیاری افعال بھی انجام دیتا ہے، لہٰذا اس اختیار کے نتیجے میں انجام پانے والے تمام افعال، اخلاق کے ذیل میں آئیں گے۔ اسی طرح انسان کے اختیاری افعال کے چار دستے ہیں: ایک، اپنی ذات سے مربوط افعال؛ دو، خدا سے سے مربوط افعال؛ تین، دیگر انسانوں سے مربوط افعال؛ چار، انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات سے مربوط افعال۔ ان چاروں دستوں سے

مربوط افعال، اخلاقی افعال کے زمرے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ افعال کے علاوہ، صفات بھی اخلاق کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ لغت میں صفت کسی انسان کی خاص حالت، عادت، خاصیت یا نشانی کے طور پر آئی ہے۔[13] صفت بنیادی طور پر کسی انسان کی ذاتی یا اندرونی حالت و کیفیت کو بیان کرتی ہے۔ اخلاق کا زیادہ تر سروکار انہی انسانی صفات سے ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی ذات میں صفات کے ایک بار رسوخ کے بعد، متعلقہ افعال کی انجام دہی نسبتاً آسان تر ہو جاتی ہے۔ دوسرے، مختلف اوقات و حالات میں درکار افعال کا چناوَ، اکثر درست ہو پاتا ہے۔ اسی کیفیت کو پائیدار نفسانی صفات یا ملکہ کہا جاتا ہے۔

علامہ محمد حسین طباطبائیؒ کے بقول انسان کے نفس اور اس کے افعال کے درمیان ایک حقیقی رابطہ ہے اور اس رابطہ کا نام ارادہ ہے۔ کسی فعل کے بارے میں علم رکھنے اور اسے انجام دینے کے درمیان جو قصد پایا جاتا ہے، وہ اسی ارادے کی ایک صفت ہے۔ اور خود یہ قصد، انسانی نفس میں اس فعل سے متعلق رجحان ہی ہے، جو اس فعل کی تحریک دلاتا ہے۔[14] اس لحاظ سے انسان کے اختیاری افعال کا منشاء، پہلے مرحلے میں علم و شناخت اور دوسرے مرحلے میں رجحان و رغبت ہے۔ اسی آگاہی و میلان کو نیت بھی کہتے ہیں۔ انسانی نفس میں ان تمایلات کی دو مرکزی انواع بیان جا سکتی ہیں۔ پہلی نوع میں انسانی فطرت کی بدولت موجود وہ عالی فطری تمایلات شامل ہیں جو کہ اچھی صفات اور انسانی کرامت وفضیلت کی بنیاد بنتے ہیں اور دوسری نوع ان طبعی اور جبلّی رجحانات پر مشتمل ہے جن کا افراطی، تفریطی یا غلط استعمال بری صفات اور انسانی رذائل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔[15]

پہلی نوع میں شامل ان فطری رجحانات کو اہمیت دینا، نہ صرف انسان کے طبعی اور جبلی رجحانات کو اپنے زیر اثر رکھتا ہے بلکہ اُن صفات کے کسب کرنے کا باعث بنتا ہے جو اس کو انسانی کرامت اور خلیفہ الہی ہونے کے مدارج تک لے جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں اسی انسانی فطرت کی طرف اشارہ ہوا ہے، خلقت میں اس کو عطا کی گئی ہے اور اس کو اپنے مقصد تک پہنچانے کی ضامن ہے: فِطۡرَةَ اللهِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا (30:30) یعنی: " اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے۔" چونکہ یہ فطری رجحانات، درست عمل کے ضامن ہوتے ہیں، لہٰذا یہاں سے اکتساب کردہ تمام صفات ممدوح اور مطلوب ہیں۔

دوسری جانب، انسان میں کچھ جبلی رجحانات خود اس کے وجود کی ناتوانی اور ضعف کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر فطری رجحانات سے روگردانی کی جائے تو یہ دیگر نا مطلوب صفات کی پیدائش کا باعث بن جاتے ہیں۔ جیسے

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ انسان حریص پیدا کیا گیا ہے: " بے شک انسان بے صبر اور لالچی پیدا ہوا ہے" (19:70) حرص کی یہ صفت بذات خود منفی نہیں، لیکن اگر یہ حرص دنیا و آخرت کے مثبت منافع سمیٹنے کے بجائے بخل اور کنجوسی کا باعث بن جائے تو یہ صفت قابل مذمت ٹھہرتی ہے۔اس کے علاوہ اس نوع میں شامل ایک تیسری قسم کی صفات ایسی ہیں جو انسانی اختیار کے غلط استعمال کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالی ہے: أَن رَّآهُ اسْتَغْنَى (7:96) یعنی: "(مگر) حقیقت یہ ہے کہ (نافرمان) انسان سرکشی کرتا ہے" کہ انسان اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ کر سرکشی کرتا ہے۔[16] پس، انسان کے وجود میں موجود مختلف رجحانات، مختلف صفات کی پیدائش کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تمام اختیاری واکتسابی صفات، اخلاق کے دائرہ کار میں شامل ہوتی ہیں۔ اس بحث کے نتیجے میں واضح ہوتا ہے کہ انسان کی ذات میں موجود ان دونوں پہلوؤں، یعنی اختیاری افعال اور اکتسابی صفات کا انتہائی مبدا، خداوند عالم کی ذات اقدس ہے۔اور اسی کے لطف اور فیض سے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کو درست طریقے سے بروئے کار لا کر اپنی زندگی کے انتہائی مقصد کی جانب بڑھ سکے۔

صفات وافعال کی ارزش اور لزوم

اب تک کی بحث کی روشنی میں انسانی افعال و صفات اخلاق کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ لیکن اگلی بحث یہ ہے کہ انسان کی اکتسابی صفات اور اختیاری افعال میں سے کون سی صفات اور افعال قدر و قیمت یا ارزش کے حامل ہیں اور لازم ہے کہ انسان انہیں انجام دے یا کسب کرے کہ اس لحاظ سے ان کو اخلاق کے دائرہ کار میں شامل کیا جا سکے؟اس سوال کے جواب میں اگر ہم انسان کے "مطلوب" کی تحلیل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی چاہت یا خواہش کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں: یا وہ چیز مختلف وجوہات کی بنا پر بذات خود مطلوب ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں قدر و قیمت کی حامل ہو جاتی ہے جیسے مثلاً مال و دولت وغیرہ۔ یا کسی دوسرے بیرونی عامل جیسے کسی حکم ودستور یا قرارداد کی بنا پر لازمی یا ضروری قرار پاتی ہے، جیسے ملکی قوانین کی پابندی وغیرہ۔[17] یہ بات واضح ہے کہ جو چیز جتنا زیادہ مطلوب ہو گی،اس کی قدر اتنا ہی زیادہ ہو گی۔ طلب کرنے کی ایک وجہ انسان کا اپنا ذوق، سلیقہ اور ذاتی چاہت ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ وجہ واقعیت نہیں رکھتی اور صرف ایک شخصی پہلو کی حامل ہوتی ہے۔اس لیے ہماری بحث سے خارج ہے۔ البتہ بعض چیزیں اس لیے مطلوب ہوتی ہیں کہ وہ دیگر زیادہ مطلوب چیزوں کی

فراہمی کا مقدمہ بنتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اس ایک آخری مطلوب چیز تک پہنچ جاتے ہیں جو بذات خود مطلوب ہوتی ہے اور دیگر کسی چیز کے مطلوب ہونے کا مقدمہ نہیں بنتی۔

پس کسی بھی صفت یا فعل کی قدر و قیمت اور ضروری ہونے کا دارومدار اس کی مطلوبیت پر ہے اور اخلاق کے اعتبار سے "مطلوبِ زندگی" وہ انتہائی چیز ہے جو بذات خود مطلوب ہو[18] اور تمام اکتسابی صفات اور اختیاری افعال اس کے حصول کا مقدمہ ہوں۔ لہٰذا جو صفات اور افعال بھی اس انتہائی مطلوب کے لیے مقدمہ قرار پائیں گے، ارزش اور قدر و قیمت کے حامل ہوں گے۔ اگر ہم خدائے حکیم و دانا کی تخلیق کردہ اس دنیا پر نظر دوڑائیں تو دیکھتے ہیں کہ اس احسن الخالقین نے اشیاء عالم کو وجود بخشنے کے ساتھ ساتھ ان کی رہنمائی بھی فرمائی ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى(50:20) یعنی: "ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کی۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام اشیاء اپنی تخلیق کے لحاظ سے اپنے مطلوب اور ہدف کو جانتی اور اس کی جانب گامزن ہیں۔ اور اس لحاظ سے کہ تمام اشیاء عالم ایک دوسرے کے ساتھ مرتبط ہیں، اس لیے ان کا آپس کا تعامل اور تاثیر بھی اسی خیر اور رہنمائی کا حامل ہے۔ پروردگار عالم نے اپنی تدبیر سے انسانی عقل کو اس خیر اور حُسن کو درک کرنے کی صلاحیت دی ہے۔[19] انسان، حکمت الٰہیہ کے تناظر میں، مختلف صفات اور افعال کی خوبیاں اور نتیجتاً ان کے مطلوب ہونے کو عقلی اور فطری طور پر درک کر سکتا ہے اور اس طرح اپنی زندگی کے مطلوب کی جانب بڑھ سکتا ہے۔

اگر ضرورت یا لزوم کی بات کریں تو کسی چیز کی لازمی یا ضروری حیثیت تین طرح سے طے کی جا سکتی ہے: اولاً، کسی دستور و حکم کی صورت میں۔ جیسے کسی بادشاہ کا حکم۔ ثانیاً، کسی قرارداد یا معاہدے کی صورت میں۔ جیسے چند افراد کا کسی کام کے کرنے پر اتفاق۔ ان دونوں حیثیتوں سے اگر کوئی صفت یا فعل ضروری اور لازم ہو بھی تو اس کی ضرورت و لزوم کو اخلاقی ضرورت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لزوم و ضرورت کی تیسری قسم یہ ہے کہ ایک چیز کسی دوسری چیز کی وجہ سے لازم ٹھہرے، چاہے کوئی دستور یا قرارداد ہو یا نہ ہو۔ جیسے بیماری کی وجہ سے دوا کے استعمال کا ضروری ہو جانا۔ اس تناظر میں وہ صفات اور افعال اخلاق کے دائرہ کار میں شامل ہوتے ہیں جو دستور اور قرارداد سے صرفِ نظر، زندگی کے مطلوبہ ہدف سے تناسب رکھتے ہوں گے اور اس ہدف کے

لیے لازم یا ضروری قرار پاتے ہوں۔ پس، اخلاقی لحاظ سے تیسری حیثیت کی ضرورت کو اخلاقی ضرورت قرار دیا جائے گا کیونکہ پہلی دو حیثیتوں کا دائرہ کار اختیاری افعال سے باہر ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس ضرورت ولزوم کے ذیل میں کوئی دستوری یا قراردادی حیثیت بھی جمع ہو سکے۔[20]

خلاصہ یہ کہ با ارزش صفات اور افعال دو طرح کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جو خود انسان کو یا اس کے آقا و مالک اور سردار کو یا چند افراد کے مجموعے (مثال کے طور پر معاشرے) کو مطلوب ہوں۔ اس کے بالمقابل وہ صفات و اِفعال ہو سکتے ہیں جو طلب کے لائق ہوں اور بالذات مطلوب ہوں یا زندگی کے مطلوب کے ساتھ میل کھاتے ہوں۔ یہ مطلوب، افراد کے سلیقہ یا رائے سے بالاتر، ثابت، مستقل اور عام ہوتے ہیں۔ اب اگر ہم زندگی کے مطلوب یا آخری ہدف کے معیار کو سامنے رکھیں تو صرف دوسری قسم کے مطلوب ہی مطلوب ہونے کے لائق ہیں کیونکہ یہ صفات اور افعال انسان کو واقعاً اس کے مطلوب تک پہنچاتے ہیں لہٰذا یہ اخلاقی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

یہاں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہر وہ فعل باارزش اور ضروری ہے جو فاعل کے سلیقے یا اس کے آقاوں کے مزاج یا سماج کے رواج کے ساتھ میل کھاتا ہو۔ لیکن یہ موقف درست نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں ہر فرد اپنے سلیقے کے مطابق جداگانہ اہداف کے پیچھے چلے گا اور کوئی اخلاقی نظام وجود میں نہیں آئے گا۔ اس کے علاوہ کسی صفت یا فعل کی درستگی یا نادرستگی اور نتیجتاً فضیلت یا رذیلت کا فتوا صادر نہیں کیا جاسکے گا اور ایک ہی کام غلط بھی ہوگا اور صحیح بھی جو کہ عقلی طور پر محال اور ناقابل قبول ہے۔ اس طرح اخلاق ایک نسبی امر بن جائے گا اور ایک صفت یا فعل ایک فرد کے لئے فضیلت اور کسی دوسرے فرد کے لیے عدم فضیلت ثابت ہو گا۔ بحث کے اس حصے کا نتیجہ یہ ہے کہ اخلاقی لحاظ سے محض وہ صفات اور اِفعال باارزش اور قدر و قیمت کے حامل اور ان کا اکتساب اور انجام دہی ضروری ہے جو یا بذات خود واقعی طور پر انسانی زندگی کا انتہائی مطلوب ہوں یا اس مطلوب کے حصول کا مقدمہ ہوں؛ چاہے انسان کو یہ صفات و اِفعال اپنا نا پسند آئے یا پسند نہ آئے: "اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لیے بہتر ہو، اور (یہ بھی) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لیے بری ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" (216:2)

سعادت، زندگی کا مطلوب اور انتہائی ہدف

علم اخلاق کی ایک اہم ترین بحث یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مطلوب اور انتہائی ہدف کیا ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب بنیادی اخلاقی فضیلت کے تعین میں انتہائی مددگار ہے۔ لہٰذا یہاں یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی مطلوب زندگی کیا ہے اور زندگی کا مطلوب کیا ہے کہ جس کے لیے تمام اکتسابی صفات اور اختیاری افعال ایک ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر اس کا مقدمہ بنیں تا باارزش یا لازم ہیں، وگرنہ نہیں؟ فلاسفہ اخلاق عمومی طور پر، انسان کی اس انتہائی مطلوب حالت کو "سعادت" کا نام دیتے ہیں۔ لغوی طور پر سعادت کا مطلب خوش نصیبی، اقبال، یا کامیابی ہے۔ دراصل سعادت اور لذّت ایک دوسرے کے بہت قریب معنی رکھتے ہیں، ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ لذّت کا لفظ کم اور مختصر دورانیہ کے لیے ہونے والے لطف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ سعادت کا لفظ پائیدار لطف یا لذّت کے لیے۔ یعنی سعادت کے اندر اُس لذّت کا مفہوم چھپا ہے جو کیفیت کے لحاظ سے برتر ہو اور کمیت کے لحاظ سے دوام پذیر ہو: وَٱلْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (17:87) یعنی: "حالانکہ آخرت (کی لذت و راحت) بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے" فوز اور فلاح، وہ دیگر دو الفاظ ہیں جو سعادت کے معنی کے قریب ہیں۔ فوز بھی کامیابی، مقصد براری اور مطلوب پر پہنچ جانے کے معنی میں ہے[21]، چاہے مادی ہو یا معنوی: رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (119:5) یعنی: "اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہی (رضائے الٰہی) سب سے بڑی کامیابی ہے۔" جبکہ فلاح کے معنی بھی کامیابی، بھلائی اور بہبودی کے ہیں۔[22] البتہ وہ کامیابی جو راستے کی مشکلات اور رکاوٹیں دور کرنے کے بعد حاصل ہو: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّىٰهَا (9:91) یعنی: "بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)۔"

مختلف فلاسفہ نے سعادت کے مختلف اصطلاحی معنی کیے ہیں جیسے ابو نصر فارابی کہتے ہیں کہ "سعادت وہ انتہائی خیر ہے جو بذات خود مطلوب ہے اور اس کے بعد کسی اور خیر کے حصول کا امکان نہیں۔"[23] بو علی سینا کے بقول: "سعادت وہ برترین مقصود ہے کہ جس کے لیے، ایک زندہ موجود کوشش کرتا ہے۔"[24] ایک اور جگہ پر آپ کہتے ہیں کہ "انسانی قوتوں کی فِعلیت ان کا کمال ہے، سعادت اسی کمال کا حصول ہے۔"[25] استاد مرتضٰی مطہری کہتے ہیں کہ "سعادت تمام یا بیشتر لذت کا حصول اور تمام یا بیشتر رنج و الم سے دوری ہے۔"[26] جبکہ علامہ محمد حسین

طباطبائیؒ کے بقول "سعادت وہ چیز ہے جو انسان ہونے کے ناطے، انسان کے لیے خیر ہےاور جو اس کو رفعت اور بلندی تک پہنچادے۔"[27] خلاصتاً، سعادت وہ خیر یا لذّت ہے جو انسان کو بذات خود مطلوب ہے۔ نیز یہ خیر کی انتہا بھی ہے، یعنی اس سے برتر کوئی اور لذّت نہیں اور اس میں دوام بھی ہے اور ثبات بھی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ آیا سعادت یا لذت وغیرہ کی طلب مذموم ہے یا قابل مدح و ستائش؟ جواب یہ ہے کہ یہ ایک فطری امر ہے اور سعادت کے حصول کے لئے کی گئی ہر کوشش اخلاقی اِفعال و صفات کے زمرہ میں قرار پاتی ہے۔ بقول استاد محمد مصباح یزدی، انسان اپنی ذات میں اس حقیقت کو درک کرتا ہے کہ وہ خیر اور لذّت چاہتا ہے۔ یہ ایک طبعی اور فطری حقیقت ہے اور انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کہ وہ ایسا نہ چاہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا ہی خلق فرمایا ہے۔ اس لیے لذت طلبی یا سعادت طلبی قابل سرزنش یا ملامت نہیں ہیں[28]: "(اے رسول ان لوگوں سے) کہو کہ اللہ کی زیب وزینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے کس نے حرام کیا ہے؟ اور کھانے کی اچھی اور پاکیزہ غذاؤں کو (کس نے حرام کیا ہے؟)! وہ تو دراصل ہیں ہی اہلِ ایمان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور خاص کر قیامت کے دن تو خالص انہی کے لیے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّهِ الَّتِيَ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالْطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُواْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (7:32) لہٰذا ہر انسان سعادت چاہتا ہے اور اسی سعادت کا حصول انسان کی زندگی کا انتہائی مطلوب اور ہدف ہے۔

ہاں! اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان سعادت ولذت کے واقعی مفہوم کو سمجھ نہ پایا ہواور ان کا حقیقی مصداق نہ ڈھونڈ پائے۔ سعادت کے مصداق کے بارے میں بھی مختلف آراء پائی جاتی ہیں، افلاطون کے نزدیک سعادت سے مراد عقلی معرفت اور حسی لذّت کی باہمی ترکیب ہے، جبکہ ارسطوکے بقول سعادت، فکر کی وہ لذّت ہے جو قوّہ عاقلہ کے فعل کی وجہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔[29] ملا صدرا کی نگاہ میں سعادت انسان کا عالم مجردات سے اتصال اوراللہ رب العزت کی قربت ہے۔[30] اس کے علاوہ بھی کئی دیگر مکاتب فکر موجود ہیں جو سعادت یا انتہائی ہدف کے مختلف مصادیق قبول کرتے ہیں جیسے اس دنیاکے مادی لذائذ کی موجودگی، قدرت و طاقت کاحصول، ہر طرح کا سود و منافع حاصل کرنا، دیگر انسانوں کا احساس کرنا یاخود شخصی ذہنی و نفسیاتی سکون و اطمینان کاحصول وغیرہ۔ کچھ مکتب ایسے بھی ہیں جو اس ہدف کے نسبی اورآزاد ہونے کے قائل ہیں اور ہر اس

ہدف کو درست مانتے ہیں جو کوئی فرد اپنے لیے پسند کرلے یا افراد کا گروہ آپس میں اتفاق سے قبول کرلے۔البتہ مکاتب یا افراد کا یہ گروہ ہماری بحث سے خارج ہے کیونکہ یہ بحث ہم کرچکے ہیں کہ افراد کے سلیقہ یا باہم قرار پانے کی بنیاد پر ارزش یا لازمی امور، اخلاق کے زمرے میں نہیں آتے۔

سعادت کیا ہے؟

یہ بات واضح ہے کہ مادی لذائذ، اعتباری ہیں اور دنیاوی قدرت اور منافع، ثبات نہیں رکھتے۔سعادت و شقاوت کا حقیقی معیار اخروی لذّت یا ابدی رنج ہے۔یعنی دنیا کی وقتی مشکلات کو تحمل کرکے اور ان سے بخوبی گزر کر ابدی اور ہمیشہ کی لذت تک پہنچنا ہی واقعی سعادت ہے[31]: إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (11:11) "سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور نیک عمل کرتے رہے، (تو) ایسے لوگوں کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔" لہٰذا، ہم سعادت کے حقیقی مصداق کو اس ہمیشگی کے معیار سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں ۔ انسان بنیادی طور پر ہر لحاظ سے ایک نیاز مند مخلوق ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (15:35) یعنی: "اے لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز، سزاوارِ حمد و ثنا ہے۔" چونکہ انسان جسم و روح کے گوناگوں پہلو رکھتا ہے اس لیے اس کی یہ طلب بھی متعدد انواع کی ہوتی ہے۔ جن میں غذا، تندرستی، امنیت، سرمایہ سے لے کر علم، احساسات، امید، نشاط، آزادی وغیرہ کا حصول شامل ہے۔ان مطلوب امور کے درمیان ایک رابطہ اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک طلب، دوسری طلب کا مقدمہ بنتی ہے اور دوسری طلب، تیسری طلب کا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے تاوقتیکہ مطلوبہ ہدف حاصل ہوجائے۔ مثلًا جسمانی سلامتی کا مقدمہ غذائی ضرورت پورا کرنا ہے۔غذائی ضرورت پورا کرنے کا مقدمہ، غذا کھانا ہے۔اور غذا کھانے کا مقدمہ، غذا کا حصول ہے۔اسی طرح غذا کے حصول کا بھی کچھ مقدمہ بنے گا۔ بالکل اسی طرح، انسانی زندگی کے مختلف کلی اہداف بھی زندگی کے اساسی ہدف کے طول میں ہوتے ہیں، تاکہ اُس اساسی ہدف کو حاصل کیا جاسکے۔ جیسے انسانی زندگی میں فردی، اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، تعلیمی، امنیّتی وغیرہ کلی اہداف کا وہ مجموعہ ہے جو زندگی کے اساسی ہدف کے حصول کا وسیلہ ہے جسے حیات طیبہ یا مطلوب زندگی کا نام دیا جاتا ہے: مَنْ عَمِلَ

صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (97:16) یعنی: "جو کوئی نیک عمل کرے (خواہ) مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے۔"

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ طلب انسان کی ذات کا حصہ ہے۔انسان اپنی ذات کے لیے سازگار امور کو خود اپنے باطن میں احساس کرتا ہے اور ان کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔جس طرح، کسی بھی قسم کے علم کے حصول کا مقدمہ انسان کے خود اپنے وجود کے بارے میں علم رکھنے پر منحصر ہے، اسی طرح کسی بھی دیگر چیز کی طلب، در نہایت اپنی ذات کی طلب، اس سے لگاؤ اور حُب رکھنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اپنی ذات کی چاہت نہ رکھتا ہو، اور اپنی ذات کے لیے سازگار امور کی خاطر کوشش نہ کرتا ہو۔[32] اس طرح انسان اپنی نیازمندی کو پورا کرتے ہوئے اپنی ذات کے مختلف پہلوؤں کو بتدریج رشد دے کر کامل کرتا چلا جاتا ہے۔پس، حبِ ذات کے آثار میں سے ایک اثر کمال کا مطلوب ہونا ہے۔ لہٰذا انسان فطری طور پر کمال طلب ہے۔ یہ طلب خدا کی عنایت کردہ ہے اور تمام انسانوں میں مشترک ہے۔ پس، سعادت اور کامیابی کا حقیقی مصداق انسان کا کمال ہے اور یہی مطلوب زندگی بھی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کمال اخلاقی صفات کو کسب کرکے اور اخلاقی افعال انجام دے کر حاصل ہوتا ہے اس لیے ہم اسے اختیاری کمال بھی کہہ سکتے ہیں: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ((46:41) یعنی: "جس نے نیک عمل کیا تو اُس نے اپنی ہی ذات کے (نفع کے) لیے (کیا) اور جس نے گناہ کیا سو (اُس کا وبال بھی) اسی کی جان پر ہے۔"

اختیاری کمال اور قرب الٰہی

عالم موجودات میں ہر وجود اپنے وجود سے متناسب کمال کی حد رکھتا ہے[33] اور اس وجود کے تمام پہلو دیکھ کر اس کمال کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جیسے درخت کا کمال، انسان کے کمال سے جدا حقیقت ہے۔ یہ مطلب واضح ہو چکا کہ اس کمال کی انتہائی حد کو پانے کے لیے کئی مقدماتی مراحل یا کلی اہداف طے کرنا ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان مقدماتی امور یا مقدماتی کمالات میں کشمکش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اُن مقدماتی کمالات کو دیگر مقدماتی کمالات پر ترجیح دی جاتی ہے جو انتہائی کمال تک پہنچانے میں زیادہ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ بات روشن ہے کہ اگر کوئی درمیان کمال، انتہائی کمال کے ساتھ ٹکراو رکھتا ہو اور اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہو تو اسے

کمال نہیں گردانا جائے گا۔مثلًا اگر ایک پھل دار درخت کی زیادہ اونچائی اس کے پھل دینے کی استعداد میں کمی کا باعث بن رہی ہو تو اس کا اونچا قد کمال نہیں ہے اور اس کی شاخوں کو کاٹا جا سکتا ہے۔

انسان کے کمال کے معیار کو تشخیص دینے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ دیگر موجودات کی نسبت، انسان کی خصوصیات اور اس کے امتیازات کو دیکھا جائے اور انسان کی ان خصوصیات کے کمال کو انسان کا اصلی کمال سمجھ لیا جائے۔ جبکہ ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موجودات کے اپنے نسبی اور مخصوص کمالات سے قطع نظر ایک مطلق، ثابت اور کامل ترین معیار کو سامنے رکھا جائے اور تمام موجودات کے کمالات کی درجہ بندی، اس کمالِ مطلق کے اعتبار سے کی جائے۔ایسی کامل ترین ذات صرف اور صرف خداوند متعال کی ہے اور اس کمال محض کے اعتبار سے ہر موجود میں کمال کی مقدار کو پہچانا جا سکتا ہے۔دوسرے لفظوں میں جو مخلوق مراتبِ کمال میں خداوند عالم کے جتنا نزدیک ہو گی، وہ اتنا کامل تر ہو گی۔ پس، اس طرح انسان کے کمال کی تشخیص کا معیار، قرب الٰہی قرار پاتا ہے۔[34]

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ انسان جتنا بھی کامل ہو جائے کبھی بھی خدا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، انسان کی کمال طلبی لامحدود ہے۔ کیونکہ کمال مطلق لامحدود ہے۔اس کمال اور قرب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ظرف، توان اور قابلیت کے مطابق الٰہی اوصاف حمیدہ اور صفات پسندیدہ کو اپنے اندر پیدا کرے اور اس طرح خدا کا بیشتر قرب حاصل کرے۔اخلاقی لحاظ سے یہی بالاترین اختیاری کمال ہے اور حقیقی فلاح، فوز اور سعادت بھی یہی ہے۔یہی وہ مقام ہے کہ جہاں انسان اسماء الٰہی کا مظہر بن کر خلیفہ الٰہی ہونے کا مقام حاصل کر لیتا ہے:[35] وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (30:2) یعنی: "اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" اس بحث کے نتیجے میں اخلاقی فضائل کا دائرہ کار واضح ہو جاتا ہے۔انسان کی اکتسابی صفات اور اختیاری افعال میں سے جو صفات اور افعال اس سعادت اور کمال کے حصول کا مقدمہ قرار پائیں گے وہ بافضیلت ہوں گے اور ان کی یہ فضیلت اس انتہائی کمال کے معیار کی حقیقت اور اصلیت کی وجہ سے ہو گی۔

بنیادی فضیلت اور اس کا معیار

بحث کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ آیا مقدماتی صفات اور افعال اپنی اپنی جداگانہ حیثیت و فضیلت رکھتے ہیں یا کسی معیار کی بنیاد پر ان میں سے کسی بنیادی فضیلت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو ان تمام بقیہ صفات و افعال کو انسان کی زندگی

کے اصلی ہدف تک پہنچانے میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے ؟ اگر دو افراد کی مثال لیں جو کسی ضرور تمند کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور فرض کریں کہ ان میں سے ایک فرد اپنی اندرونی فضیلت کی وجہ سے اس مدد کا رجحان رکھتا ہے جبکہ دوسرا فرد اپنی شہرت اور تعریف کی خاطر یہ کام کر رہا ہو۔ یہ واضح ہے کہ ان دونوں افراد کا فعل بھی خوب ہے اور فعل کا نتیجہ بھی ایک طرح کا ہی ہے۔ لیکن ان کے کام کرنے کی نیت اور محرک جدا جدا ہے۔[36] یہ نیت، محرک یا ارادہ، آگاہی اور رجحان کا مجموعہ ہوتا ہے اور انسان کے نفس اور اس کے افعال کے درمیان ایک حقیقی رابطے کا نام ہے۔ لہٰذا اس نیت یا محرک کے جدا ہونے کا انسان کے نفس پر الگ الگ اثر ہوتا ہے۔ یعنی فعل کے اچھا یا برا ہونے کے ساتھ ساتھ، کسی شخص کے اختیاری فعل انجام دینے کا کوئی خاص محرک بھی ہوتا ہے اور ان دونوں پہلوؤں کو اخلاقی معیارات پر پرکھ کر کلی طور پر اس عمل کی قدر و قیمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

لغت میں بھی نیت کا معنی قصد، ارادہ، عزم، رجحان اور میلان ہی نقل ہوا ہے۔[37] اصطلاحاً، نیت وہ قصد ہے جو انسان کو کسی فعل کے انجام دینے پر ابھارتا ہے۔[38] محقق طوسی نے بھی نیت کو فعل کے انجام دینے کا قصد اور علم و عمل کے درمیان واسطہ بیان کیا ہے۔[39] آیت اللہ مصباح یزدی فرماتے ہیں کہ نیت افعال کو انجام دینے کے لیے اختیاری اور آگاہانہ محرک کا نام ہے۔[40] پس، یہ واضح ہے کہ نیت وہ ایک بنیادی عامل ہے جو کسی بھی فعل کے باارزش ہونے کا معیار بنتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے اختیاری کمال کا انتہائی معیار قرب خداوندی کا حصول ہے یعنی اس کمال کے مقرر کرنے میں انسانی ارادے، نیت، خواہش یا قرارداد کا کوئی کردار نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی ایک طبعی اور حقیقی نیاز ہے۔ دوسری جانب اس کمال کا حصول اکتسابی صفات اور اختیاری افعال پر منحصر ہے اور ان صفات اور اعمال کی بنیاد نیت ہے۔ پس وہ نیت جو خدا کی خوشنودی اور اس کے قرب و رضایت کے حصول کی خاطر افعال کو انجام دے گی، اس درکار کمال کی راہ کے مراحل کو طے کر پائے گی، ورنہ وہ اچھے کام تو انجام دے پائے گی مگر ان کاموں کا محرک درست نہ ہونے کی بنا پر وہ تاثیر پیدا نہیں کر پائے گی جو انسان کو اس کے انتہائی ہدف تک پہنچا سکے۔ پس افعال کے خوب ہونے کے ساتھ ساتھ، نیت کا اس درست معیار پر ہونا بھی ضروری ہے اور یہ دونوں پہلو مل کر کسی فعل کی فضیلت کو کامل کرتے ہیں: وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ (2:284) یعنی: "وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں خواہ انہیں ظاہر کرو یا انہیں چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔"

جس طرح قرب خداوندی ایک حقیقت ہے، اسی طرح نیت کا اثر بھی حقیقی ہے اور واقعیت رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، نیت کی اچھی یا بری تاثیر ،براہ راست انسان کے نفس پر ڈالتی ہے۔نیت کے بغیر عمل ایسا ہی ہے جیسے روح کے بغیر جسم، ایسا عمل جو انجام دینے والے کے دل اور روح پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتا: " إنما الأعمال بالنیات، ولکل امرئ مانوی" یعنی: " بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور انسان کے لیے وہی باقی رہے گا، جس کی اس نے نیت کی" لہٰذا، انسان کے نفس اور زندگی مطلوب کے لیے درکار صحیح معیار اور مطلوبہ اثر کی حامل نیت وہ ہے جو قربت پروردگار کی حامل ہو۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نیت کا اثر اسکے درجات کے مطابق ہوتا ہے، یعنی خالص خدا کی قربت کی نیت، یا خدا کی نعمات کے حصول کی نیت، ثواب پانے یا عذاب سے بچنے کی نیت، یا پھر فقط کسی کی حاجت پوری کر دینے کی نیت، اپنا الگ الگ اثر رکھتی ہیں اور ان میں سے کامل ترین درجہ خالص خدا کی قربت کی نیت کا ہے۔

پس توحید پرستی اور تقرب الہی وہ بنیادی صفت ہے جو دیگر تمام انسانی صفات وافعال کو خالق یکتا کی جانب رخ دیتی ہے۔ اس بنیادی صفت کے بغیر انسان اچھے افعال کرنے پر قادر تو ہوتا ہے، مگر ان افعال کا انسانی نفس پر وہ مطلوب اثر نہیں ہوتا جو اسے اس دنیا اور اگلی دنیا میں سعادت مند کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور رضایت کی چاہت، یعنی اس وحدہ لاشریک کی پرستش، تعظیم اور توقیر، وہ بنیادی صفت یا فضیلت ہے جو تمام انسانی صفات اور افعال کو ارزشمند کرتی ہے۔ یہ معرفت اور چاہت جتنا زیادہ ہو گی، نیت اتنا ہی خالص ہو گی اور انسانی کمال کے اتنے زیادہ مدارج طے ہو سکیں گے۔

بنیادی فضیلت کی خصوصیات

پروردگار عالم ہمارا حقیقی خالق اور اصلی مالک ہے۔ اس کی بخشش اور عطا کی بدولت ہی انسان اپنے وجود اور توانائیوں کی اعتباری مالکیت رکھتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس جہان میں ہر وہ مادی اور غیر مادی چیز خلق فرمائی ہے جس کے لیے انسان نیاز مند تھا۔ اللہ تعالی، یہ مالکیت، تدبیر، عنایت، لطف اور احسان اس بات کے متقاضی ہیں کہ دل و جان سے اس کی اطاعت کرتے ہوئے صرف اس کی پرستش کی جائے تا کہ اس کی اطاعت کا حق ادا ہو سکے۔[41] اس بنیاد پر ہر انسانی فعل کی قدر و قیمت اس نکتے پر منحصر ہے کہ نیت کے وسیلے سے وہ فعل، اللہ

تعالیٰ سے کس قدر مربوط ہے۔ پس، خدا پر ایمان، انسان کے نفس میں خداپرستی کے ظہور کی علامت، اور نتیجے کے طور پر اخلاقی فضائل کی روح اور حقیقی بنیاد ہے، "جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔ " (103:2)

ایمان کے بارے میں ایک اہم چیز یہ ہے کہ خدا پر ایمان، ایک اختیاری اور قلبی امر ہے جو علم کے ساتھ ساتھ میلان و رجحان بھی چاہتا ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی چیز کا علم تو رکھے مگر ساتھ ہی اس کا انکار بھی کر دے: وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (14:27) یعنی: "اور انہوں نے ظلم اور تکبّر کے طور پر ان کا سراسر انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں کے حق ہونے) کا یقین کر چکے تھے۔" اور اس بات کا امکان بھی ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کی معرفت کے بغیر ہی اس کا رجحان پیدا کر لے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (170:2) یعنی: "اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اسی (روش) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پر ہوں۔"

پس، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی ذات سے لگاؤ، ایمان کی تکمیل کے لیے یہ دونوں لازم و ملزوم امور ہیں۔

ایمان کے بارے میں دوسری اہم چیز اس پر عمل ہے۔ قرآن کریم میں پچاس سے زیادہ مقامات پر ایمان کو عمل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صرف ایمان یا خالی عمل کافی نہیں ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر، اکیلے ہی قرب خداوندی کا باعث بن سکیں۔ پس، خدا کی ذات کا علم، اس کو تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا خود بخود عمل کا متقاضی ہے، ورنہ ایمان کامل نہیں۔ دوسری جانب عمل کرنا مگر ایمان نہ رکھنا، اُس کافی فضیلت کا حامل نہیں کہ قربِ خداوندی تک پہنچا سکے۔[42] پس، ایمان خود سعادت نہیں ہے، بلکہ سعادت کے حصول کا عامل اور ایک اختیاری عمل ہے۔ نیز ایمان کے حصول کی ایک شرط معرفت ہے اور یہ معرفت کے بعد حاصل ہونے والی ایک قلبی کیفیت ہے۔

اس بحث کا ایک اور اہم پہلو جس کا ذکر ضروری ہے کہ خداپرستی اور خدا کا بتدریج قرب، انسان کے اندر دو اہم خصوصیات کی پیدائش کا موجب بنتے ہیں۔ اولاً، ہم جانتے ہیں کہ انسان کا خود اپنے بارے میں علم رکھنا، خود اس

کے اپنے وجود کا حصہ ہے۔اس لیے انسان کا وجود جتنا کامل ہوتا چلا جاتا ہے، اس کی اپنی ذات اور اپنی خصوصیات کے بارے میں آگاہی بھی اتنی کامل ہوتی چلی جاتی ہے۔جیسے جیسے اپنی ذات سے اس کی آگاہی بڑھتی جاتی ہے، اس کا اپنے عین نیاز مند ہونے اور اپنے پروردگار کے مطلق بے نیاز ہونے کا احساس بھی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سمجھ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک لحظے بھی کی جدائی، اس کی اپنی نابودی کے مترادف ہے۔انسان جتنا کمال پاتا جاتا ہے، اپنی بڑھتی آگاہی کی بدولت، اپنی عین نیازمندی اور خدا کی کامل و مطلق ذات کی بے نیازی محض کا بہتر ادراک حاصل کرتا چلا جاتا ہے: "اے لوگو! تم (سب) اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز ہے جو قابلِ تعریف ہے۔"(15:35) خدا کی یہ آگاہانہ حضوری معرفت، انسان کو مزید بالاتر کمالات کے لیے آمادہ کرتی ہے اور پھر وہ خدا کے علاوہ کسی دیگر چیز کے لیے استقلال اور ثبات کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا۔[43]

اس کیفیت سے انسان کے باطن میں جو دوسری اہم خاصیت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کمال اور تقرب کے زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ، انسان کے اندر خدا کی محبت بیش تر ہوتی چلی جاتی ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (165:2) یعنی: اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں" اور اس کی رضایت کی زیادتی، "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" (54:5) جن سے وہ (خود) محبت فرماتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے" کو بھی احساس کرتا چلا جاتا ہے۔اس طرح انسان دنیا و آخرت کی بہترین اور کبھی ختم نہ ہونے والی لذّت کا احساس کرلیتا ہے: قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ (32:7) یعنی: "کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔"خدا جیسی بے نیاز ذات کے حضور کا ادراک اس کو بالاترین قدرت و توانائی کی موجودگی کا احساس دیتا ہے اور وہ ہر لمحہ اپنے جسم و روح کی تمام مطلوب استعدادوں اور قابلیتوں کے مزید کمال کا مشتاق رہتا ہے تاکہ قرب خداوندی کا یہ سفر جاری رہ سکے۔ کمال طلبی اور سعادت مندی کے اس تناظر میں دیکھا جائے توانسان کے کچھ کمالات صرف اپنی ذات کی بدولت امکان پذیر ہوتے ہیں جبکہ کچھ کمالات، جیسے ایثار، انفاق وغیرہ ایسے ہیں جو صرف دیگر افراد کی کاملّیت یا ان کی نیاز پورا کرنے کا وسیلہ بن کر حاصل ہو سکتے ہیں۔جبکہ کمالات کا ایک دستہ ایسا بھی ہے جس کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دیگر افراد کے لیے افعال انجام دے کر حاصل کیا جاتا ہے۔اگر غور کیا جائے تو ان تینوں

دستوں کے کمالات، در حقیقت انسان کی اپنی ذات کے لیے ہی ہوتے ہیں کیونکہ وہ حُسن نیت سے قرب الٰہی کے لیے، چاہے اپنی ذات کے لیے کام کرے، کسی اور کے لیے کرے یا سب کے لیے کرے، ہر صورت اس کا اپنا کمال حتمی ہے۔ دوسری طرف انسان کا اپنا کمال در حقیقت خدا کے قرب کے علاوہ کچھ نہیں،اس لحاظ سے ہر طرح کی کمال طلبی اور سعادت مندی کا، ہر اعتبار سے محور، فقط خدا کی ذات ہے،: إِنَّا لِلَّـهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ(2:156) یعنی: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔"

نتیجہ

انسان کی زندگی کا اعلیٰ ترین ہدف اور مطلوب سعادت کا حصول ہے۔ سعادت کے حصول کے لئے اخلاقی افعال کی انجام دہی اور اخلاقی صفات کسب کرنا شرط اور مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سعادت قرب خداوندی کے حصول اور خدا پرستی کے علاوہ کچھ نہیں۔ خداوند عالم وہ تنہا حقیقت ہے کہ جس کے دم سے ساری کائنات قائم ہے۔ لہٰذا ہر موضوع کی ابتدا اور انتہا کا درست معیار صرف اور صرف اسی کی ہی ذات اقدس ہے۔اس واقعی اور حقیقی، ہدف اور بنیاد کے علاوہ دیگر اہداف و بنیادیں، یا تو غیر واقعی اور اعتباری ہیں یا ناقص اور غیر متناسب۔ لہٰذا اخلاقی موضوعات کے دائرہ کار میں وہ تمام اکتسابی صفات اور اختیاری افعال شامل ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیار اور توفیق سے، قرب خداوندی کے لیے، قرب خداوندی کی نیت سے انجام دیے جائیں۔ علاوہ ازیں، اخلاقی اختیاری افعال و صفات کا سرچشمہ اور ان کی قدر و قیمت اور لزوم کا معیار، سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خلقت، کرامت اور حکمت کی طرف پلٹتا ہے۔ افعال کا خوب ہونا اور نیت کا درست ہونا، وہ دو بنیادی عامل ہیں جو ملکر کسی صفت یا فعل کو افضل بناتے ہیں۔انسان کا اپنی ذات میں عین نیاز ہونا اور اپنی ذات کی چاہت کی وجہ سے کمال کا طالب ہونا، خدا کے قرب کے متقاضی ہیں۔دوسری جانب خدا پرستی کے رجحان کے بغیر، انسان کی نیت اور ارادہ، اس کے کمال کی ضمانت نہیں ہیں۔اس لحاظ سے اخلاقی صفات اور افعال کے دائرہ کار میں خدا پرستی یا اللہ تعالیٰ پر ایمان وہ بنیادی اور حقیقی فضیلت ہے جو دیگر تمام فضائل کی بنیاد اور اساس ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ محمد تقی، مصباح یزدی، *اخلاق در قرآن*، ج 1 (قم، انتشارات موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، 1394 شمسی)، 31-30۔

2۔ محمد نصر، اصفہانی، "تشابہ ہای اندیشہ اخلاقی امام خمینی با افلاطون"، *مجموعہ آثار کنگرہ اندیشہ ہای اخلاقی عرفانی امام خمینی*، جلد 8، شمارہ 1، (1382 شمسی):549۔

3۔ احمد، عابدی، "ارزیابی مقایسہای نظریۂ اعتدال ارسطوئی و نظریۂ اخلاقی اسلام"، *فلسفہ دین*، جلد 11، شمارہ 4، (1393 شمسی): 624

4۔ علی، صبری، "رابطہ سعادت وفضیلت از دیدگاہ ارسطو و فارابی"، *الہیات تطبیقی*، جلد 7، شمارہ 16، (1395 شمسی): 6 ۔

5۔ ابن مسکویہ، ابو علی احمد بن محمد، *تہذیب الأخلاق وتطہیر الأعراق*، (دمشق، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، چاپ اول، سن ندارد)، 128۔

6۔ غزالی، محمد بن محمد، احیاء *علوم الدین*، ج 8 (بیروت، دار الکتب العربی، چاپ اول، سن ندارد)، 97۔

7۔ نصیر الدین طوسی، محمد بن محمد، *اخلاق ناصری*، (تہران، علمیہ اسلامیہ، چاپ اول، سن ندارد)، 72۔

8۔ تقی، محدر، "مبدا فضائل ورذائل از دیدگاہ علامہ طباطبائی"، *معرفت اخلاقی*، جلد 8، شمارہ 2، (1396 شمسی): 8۔

9۔ محمد بن مکرم، ابن منظور، *لسان العرب*، ج 10 (بیروت، دار صادر، 1414 ہجری)، 86۔

10۔ امیر، خواص، *فلسفہ اخلاق* (قم، دفتر نشر معارف، 1388 شمسی)، 16۔

11۔ مصباح یزدی، *اخلاق در قرآن*، ج 1، 25۔

12۔ عبداللہ، نصری، "جبر واختیار از دیدگاہ علامہ طباطبائی"، *حکمت وفلسفہ*، جلد 9، شمارہ 4 (2014): 78۔

13۔ http://udb.gov.pk/result.php?search=صفت

14۔ عبداللہ، نصری، "جبر واختیار از دیدگاہ علامہ طباطبائی"، *حکمت وفلسفہ*، 72۔

15۔ عبداللہ، جوادی آملی، *تفسیر انسان بہ انسان* (قم، مرکز نشر اسراء، 1395 شمسی)، 213۔

16۔ رضا علی، نوروزی، "بررسی و تبیین مفہوم «انسان متعالی» از منظر قرآن کریم"، *پژوھش نامہ معارف قرآنی*، جلد 4، شمارہ 14 (1392 شمسی): 116۔

17۔ مجتبیٰ، مصباح، *فلسفہ اخلاق: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی* 4 (قم، انتشارات موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، 1398 شمسی)، 42۔

18۔ مصباح، *فلسفہ اخلاق*: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی 4، 44۔

19۔ غلامعلی، سنجری، *درسنامہ عقاید*، (قم، سفیر سلامت، 1395 شمسی)، 137۔

20۔ مصباح، *فلسفہ اخلاق*: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی 4، 62۔

21. http://udb.gov.pk/result.php?search=فوز

22. http://udb.gov.pk/result.php?search=فلاح

23۔ محمد تقی، یوسفی، درس نامہ علم النفس فلسفی (قم، انتشارات موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، 1392 شمسی)، 269۔

24۔ عین اللہ، خادمی، "سعادت از نظر ابن سینا"، فلسفہ دین، جلد 7، شمارہ 5 (1389 شمسی): 115

25۔ محمد تقی، یوسفی، درس نامہ علم النفس فلسفی، 271

26۔ مرتضیٰ، مطہری، مجموعہ آثار استاد شہید مطہری، ج 7 (قم، انتشارات صدرا، 1374 شمسی)، 55۔

27۔ محمد حسین، طباطبائی، ترجمہ تفسیر المیزان (مترجم: موسوی، محمد باقر)، ج 1 (قم، دفتر انتشارات اسلامی، 1374 شمسی)، 175۔

28۔ مصباح یزدی، اخلاق در قرآن، ج 1، 31۔

29۔ ابراہیم، یعقوبی، "سعادت از دیدگاہ ملا صدرا و علّامہ طباطبایی"، فصلنامہ علمی۔پژوہشی دانشگاہ قم، جلد 10، شمارہ 1 1387 (شمسی): 220۔

30۔ یوسفی، درس نامہ علم النفس فلسفی، 279۔

31۔ یوسفی، درس نامہ علم النفس فلسفی، 282۔

32۔ مصباح، فلسفہ اخلاق: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی 4، 171-172۔

33۔ عبداللہ حاجی، صادقی، "انسان کامل در اندیشہ مطہری"، فصلنامہ علمی۔پژوہشی در حوزہ فلسفہ دین و کلام جدید، جلد 22، شمارہ 30 (1383 شمسی): 3۔

34۔ مصباح، فلسفہ اخلاق: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی 4، 197۔

35۔ عبداللہ، جوادی آملی، انسان از آغاز تا انجام (قم، مرکز نشر اسراء، 1395 شمسی)، 106۔

36۔ امیر، خواص، فلسفہ اخلاق، 81۔

37 . http://udb.gov.pk/result.php?search=نیت

38۔ روح اللہ، خمینی، آداب الصلوۃ (قم، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، 1373 شمسی)، 156۔

39۔ مشکینی، درس ہای اخلاق، ترجمہ علی رضا فیض (قم، پارسیان، 1380 شمسی)، 64۔

40۔ مجتبی، مصباح، "نقش نیت در ارزش اخلاقی"، فصلنامہ تخصصی اخلاق وحیانی، شمارہ 2، (1391 شمسی): 83۔

41۔ جعفر صدر، کلاری، روش استنباط، ج 1 (قم، انتشارات شہیدین زین الدین، 1392 شمسی)، 201۔

42۔ مصباح یزدی، اخلاق در قرآن، ج 1، 117۔

43۔ مصباح، فلسفہ اخلاق: سلسہ دروس مبانی اندیشہ اسلامی 4، 202۔

Bibliography

1) *Falsalnamah-ye Takhassus-e Akhlāq-e Wahyani*, issue 2 (1391/2012), p???
2) *Fasalnamah-ye Pajūhishi dar Hawzah-ye Falsafah-ye Dīn-o Kalām-e Jadīd*, vol. 22, issue 30 (1383/2004), p???
3) *Fasalnamah-ye Pajūhishi-e Danishgah-ye Qum*, vol. 10 (1387/2008), p???
4) Ghazali, Muhammad bin Muhammad, *Ahya Ulūm al-Dīn*, Beirut, Dar al-Kutub al-Arabi, nd.
5) Ibn Manzūr, Muhammad bin Mukarrum, *Lisān al-Arab*, Beirut, Dar Sadir, 1414/1003.
6) Islami, Reda, *Qawa'id-e Kulli-ye Istinbāt*, Qum, Mua'ssasa-ye Bustān-e Kitāb, 1386/2007.
7) Ibn Miskawayh, Abu Ali Ahmad bin Muhammad, *Tahzīb al-Akhlāq wa Tathīr al-Aa'rāq*, Damascus, Maktaba al-Thaqafah al-Diniyyah, nd.
8) Jawadi-Amoli, Abdullah, *Tafsīr-e Insān ba Insān*, Qum, Markaz-e Nashr-e Isrā', 1395/2016.
9) Javadi-Amoli, Abdullah, *Insān az Aghāz ta Unjām*, Qum, Markaz-e Nashr-e Isra', 1395/2016.
10) Khawās, Amir, *Falsafa-ye Akhlāq*, Qum, Daftr-e Nashr-e Maā'rif, 1388/2009.
11) Khomeini, Ruhollah, *Adāb al-Salāh*, Qum, Mua'ssasa-ye Tanzīm-o Nashr-e Athār-e Imam Khoemini, 1373/1994.
12) Kalari, Jafar Sadr, *Rawish-e Istinbāt*, Qum, Intisharāt Shahidyn Zayn al-Dīn, 1392/ 2013.
13) Misbah Yazdi, Muhammad Taqi, *Akhlāq dar Quran*, Qum, Intisharāt-e Mua'ssasa-ye Amuzashi wa Pajuhishi Imam Khomeini, 1394/2015.
14) Misbah, Mujtaba, *Falsafa-ye Akhlāq*: Silsila-ye Durūs-e Mabani Andesha-ye Islami, Vol. 4, Qum, Intisharāt-e Mua'ssasa-ye Amuzashi wa Pajuhishi Imam Khomeini, 1398/2019.
15) Misbah Yazdi, Muhammad Taqi, *Amozish-e Falsafa*, Qum, Sazmān-e Tablighāt-e Islami, 1366/1987.
16) Mutahhari, Murtada, *Majmoa'h-ye Athār-e Ustad Shahīd Mutahhari*, Qum, Intisharāt-e Sadra, 1374/1995.
17) Majlisi, Muhammad Baqir, *Bihār al-Anwār*, Beirut, Mua'ssasa al-Wafā, 1983.
18) Mishkini, *Darsha-ye Akhlaq*, Translated by Alireza Faiz, Qum, Parsiyan, 1380/2001.
19) Nasīr al-Dīn Tusi, Muhammad bin Muhammad, *Akhlaq-e Nasiri*, Tehran, Ilmiyyah Islamiyyah, nd.
20) *Pajūhishnamah-ye Maā'rif-e Quran*, vol. 4, issue 14 (1392/2013), 116-?
21) Sanjari, Ghila Mua'lla, *Darsnama-ye Aqai'd*, Qum, Safīr-e Salamat, 1395/2016.

22) Seyyed, Radi, *Nahj al-Balagah uz Amīr al-Muminīn*, Translated by Mufti Jafar Hussain, Lahore, al-Miraj Company, 2003.

23) Tabataba'I, Muhammad Husyn, *Tafsīr al-Mizān*, Translated by Muhammad Baqir Mosavi, Qum, Daftr-e Intisharāt-e Islami, 1374/1995.

24) Yusufi, Muhammad Tqai, *Darsnam-ye Ilm al-Nafs-e Falsafi*, Qum, Intisharāt-e Mua'ssasa-ye Amuzashi wa Pajuhishi Imam Khomeini, 1392/2013.